

پچانے کے لیے ضرورت اس کا اتفاق کرتی ہے۔ اور یہ کام غیبت محرمہ نہیں ہے بلکہ اللہ اور رسول صلی اللہ علیہ وسلم اور مسلمانوں کی خیر خواہی کے قبیل سے ہے۔ اور فضلاء ائمہ اور ان کے اخبار اور وہ لوگ جو ان میں سے بڑے پرہیزگار تھے یہ کام کہتے ہیں۔“

قرآن مجید میں قراءتوں کا اختلاف

سوال: ذیل میں درج شدہ مسئلہ کے متعلق آپ کی رہنمائی چاہتا ہوں۔ امید ہے تفصیلی دلائل سے واضح فرمائیں گے:

”قرآن مجید کے متعلق ایک طرف تو یہ کہا جاتا ہے کہ یہ بعینہ اُسی صورت میں موجود ہے جس صورت میں حضور اکرم پر نازل ہوا تھا۔ حتیٰ کہ اس میں ایک شوشے یا کسی زیر زبر کی بھی تبدیلی نہیں ہوئی۔ لیکن دوسری طرف بعض معتبر کتب میں یہ درج ہے کہ کسی خاص آیت کی قراءت مختلف طریقوں سے مروی ہے جن میں اعراب کا فرق عام ہے بلکہ بعض جگہ تو بعض عبارات کے اختلاف کا ذکر تک کیا گیا ہے۔“

اگر پہلی بات صحیح ہو تو اختلاف قراءت ایک مبہل سی بات نظر آتی ہے لیکن اس صورت میں علماء کا اختلاف قراءت کی تائید کرنا سمجھ میں نہیں آتا۔ اور اگر دوسری بات کو صحیح مانا جائے تو قرآن کی صحت بھروسہ ہوتی نظر آتی ہے۔ یہ بات تو آپ جانتے ہی ہیں کہ اعراب کے فرق سے عربی کے معانی میں کتنا فرق ہو جاتا ہے۔

یہاں میں یہ عرض کر دینا بھی مناسب سمجھتا ہوں کہ منکرین حدیث کی طرف میرا فرقہ پھر بھی میلان نہیں ہے بلکہ صرف مسئلہ سمجھنے کے لیے آپ کی طرف رجوع کر رہا ہوں۔“

لے شروع مسلم، باب بیان الاسناد من العین۔

جواب۔ یہ بات اپنی جگہ بالکل صحیح ہے کہ قرآن مجید آج ٹھیک اسی صورت میں موجود ہے جس میں خود نبی صلی اللہ علیہ وسلم پر نازل ہوا تھا، اور اس میں ذمہ برابر کوئی تبدیلی نہیں ہوئی ہے۔ لیکن یہ بات بھی اس کے ساتھ قطعی صحیح ہے کہ قرآن میں قراتوں کا اختلاف تھا اور ہے۔ جن لوگوں نے اس مسئلے کا باقاعدہ علمی طریقے پر مطالعہ نہیں کیا ہے وہ محض سطحی نظر سے دیکھ کر بے تکلف فیصلہ کر دیتے ہیں کہ یہ دونوں باتیں باہم متضاد ہیں اور ان میں سے لازماً کوئی ایک ہی بات صحیح ہو سکتی ہے، یعنی اگر قرآن صحیح طور پر حضور سے نقل ہوا ہے تو اختلافات قرات کی بات غلط ہے۔ اور اگر اختلاف قرات صحیح ہے تو پھر معاذ اللہ قرآن ہم تک صحیح طریقے سے منتقل نہیں ہوا ہے۔ حالانکہ فیصلے صادر کرنے سے پہلے یہ لوگ کچھ علم حاصل کرنے کی کوشش کریں تو خود بھی غلط فہمی سے بچ جائیں اور دوسروں کو غلط فہمیوں میں مبتلا کرنے کا وبال بھی اپنے سر نہ لیں۔

یہ ایک تاریخی حقیقت ہے کہ جس رسم الخط میں ابتداءً نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے وحی کی کتابت کرائی تھی اور جس میں حضرت ابوبکرؓ نے پہلا مصحف مرتب کرایا اور حضرت عثمانؓ نے جس کی نقل بعد میں شائع کرائی، اس کے اندر نہ صرف یہ کہ اعراب نہ تھے بلکہ نقطے بھی نہ تھے کیونکہ اس وقت تک یہ علامات ایجاد نہ ہوئی تھیں۔ اس رسم الخط میں پورے قرآن کی عبارت یوں لکھی گئی تھی:

کتاب احکم الله مصلح من لدن حکم حسد
اس طرز تحریر کی عبارتوں کو اہل زبان اُٹکل سے پڑھ لیتے تھے اور بہر حال بامعنی بنا کر ہی پڑھا کرتے تھے، لیکن جہاں مفہوم کے اعتبار سے مشابہ الفاظ آجاتے، یا زبان کے قواعد و محاورہ کی رو سے ایک ہی لفظ کے کئی تلفظ یا اعراب ممکن ہوتے، وہاں خود اہل زبان کو بھی بکثرت التباسات پیش آجاتے تھے اور یہ تعین کرنا مشکل ہو جاتا تھا کہ کھنٹے والے کا اصل غشا کیا ہے۔ مثلاً ایک فقرہ گزریوں لکھا ہو کہ ما ساعد من اسعاراً تو اسے دَرَبًا بَاعِدَ بَيْنَ اسْمَاءٍ بَيْنَ بَيْنَ یا بِنَا بھی پڑھا جاسکتا تھا اور دَرَبًا بَاعِدَ بَيْنَ اسْمَاءٍ بَيْنَ بَيْنَ یا بِنَا بھی۔ اسی طرح اگر ایک عبارت یوں لکھی ہو کہ اسطر

إِلَى الْعِطَامِ كَيْفَ مَسَّرَهَا تَوَاسَّ أَنْظُرْ إِلَى الْعِطَامِ كَيْفَ نَشَّرَهَا بِحَبِيْثٍ هَاجِجٍ
تَهَاوَدَ كَيْفَ نَشَّرَهَا بِحَبِيْثٍ -

یہ اختلافات تو اس رسم الخط کے پڑھنے میں اہل زبان کے درمیان ہو سکتے تھے، لیکن ایک عربی تحریر اگر اسی رسم الخط میں غیر اہل زبان کو پڑھنی پڑ جاتی تو وہ اس میں ایسی سخت غلطیاں کر جاتے جو قائل کے منشا کے بالکل برعکس معنی دیتی تھیں۔ مثلاً ایک دفعہ ایک مجھی نے آیت اِنَّ اللّٰهَ بِرِیْضٍ مِّنَ الْمُشْرِکِیْنَ وَرِیْضُوْهُ فِی لَفْظٍ وَرِیْضُوْهُ کا اعراب وَرِیْضُوْہ پڑھا جس سے معنی یہ بن گئے کہ اللہ بری الذمہ ہے مشرکین سے اور اپنے رسول سے " معاذ اللہ -

پھر یہ بھی ایک تاریخی حقیقت ہے کہ قرآن میں اعراب لگانے کی ضرورت سب سے پہلے بصرے کے گورنر زیاد نے محسوس کی جو ۴۵ھ سے ۵۳ھ تک وہاں کا گورنر رہا تھا۔ اس نے ابو الاسود دؤلی سے فرمائش کی کہ وہ اعراب کے ایسے علامات تجویز کریں اور انہوں نے یہ تجویز کیا کہ مفتوح حرف کے اوپر مکسور حرف کے نیچے اور مضموم حرف کے بیچ میں ایک ایک نقطہ لگا دیا جائے۔ اس کے بعد عبدالملک بن مروان (۶۵ تا ۸۶ھ) کے عہد حکومت میں حجاج بن یوسف دالی عراق نے دو علماء کو اس کام پر مامور کیا کہ وہ قرآن کے قشایہ حروف میں تیز کرنے کی کوئی صورت تجویز کریں۔ چنانچہ انہوں نے پہلی مرتبہ عربی زبان کے حروف میں بعض کو منقوط اور بعض کو غیر منقوط کے اور منقوط حروف کے اوپر یا نیچے ایک سے لیکر تین تک نقطے لگا کر فرق پیدا کیا اور ابو الاسود کے طریقے کو بدل کر اعراب کے لیے نقطوں کے بجائے زیر و بر پیش کی وہ حرکات تجویز کیں جو آج مستعمل ہیں۔

ان دو تاریخی حقیقتوں کو نگاہ میں رکھ کر دیکھیے کہ اگر قرآن کی اشاعت کا دار مدار صرف تحریر پر ہوتا تو جس رسم الخط میں امت کو یہ کتاب ملی تھی اس کو پڑھنے میں تلفظ اور اعراب ہی کے نہیں، قشایہ حروف کے بھی کتنے بے شمار اختلافات ہو گئے ہوتے۔ محض زبان اور اس کے قواعد کی بنا پر خود اہل زبان بھی اگر نقطے اور اعراب لگانے بیٹھتے تو قرآن کی ایک ایک سطر میں بیسیوں اختلافات

کی گنجائش نکل سکتی تھی اور کسی ذریعہ سے یہ فیصلہ نہ کیا جاسکتا تھا کہ اصل عبارت جو نبی صلی اللہ علیہ وسلم پر نازل ہوئی تھی وہ کیا تھی۔ اس کا اندازہ آپ خود اس طرح کر سکتے ہیں کہ اردو زبان کی کوئی عبارت بے نقط لکھ کر دس بیس زبان داں اصحاب کے سامنے رکھ دیں۔ آپ دیکھیں گے کہ ان میں سے کسی کی قرأت بھی کسی دوسرے کی قرأت کے مطابق نہ ہوگی۔ اس سے یہ بات واضح ہو جاتی ہے کہ قرآن میں نقطے اور اعراب لگانے کا کام محض لغت اور قواعد زبان کی مہارت کے بل بوتے پر نہیں کیا جاسکتا تھا، کیونکہ اس طرح ایک مصحف نہیں بے شمار مصاحف تیار ہو جاتے جن میں الفاظ اور اعرابوں کے ان گنت اختلافات ہوتے، اور کسی نسخے کے متعلق بھی یہ دعویٰ نہ کیا جاسکتا کہ یہ ٹھیک اس تنزیل کے مطابق ہے جو نبی صلی اللہ علیہ وسلم پر نازل ہوئی تھی۔

اب وہ کیا چیز ہے جس کی بدولت آج دنیا بھر میں ہم قرآن کا ایک ہی متفق علیہ متن پاس ہیں اور جس کی بدولت قراتوں کے اختلافات امکانی وسعتوں تک پھیلنے کے بجائے صرف چند متواتر یا مشہور اختلافات تک محدود رہ گئے؟ یہ اُسی نعمت کا صدقہ ہے جس کی قدر گھٹانے اور جس پر اعتماد اٹھانے کے لیے منکرینِ حدیث ایڑی چوٹی کا زور لگا رہے ہیں، یعنی روایت!

اوپر جن دو تاریخی حقیقتوں کا ذکر کیا گیا ہے ان کے علاوہ ایک تیسری اہم ترین تاریخی حقیقت بھی ہے، اور وہ یہ ہے کہ قرآن کی اشاعت ابتدائے تخریب کی صورت میں نہیں بلکہ زبانی تلقین کی صورت میں ہوئی تھی۔ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے قرآن کی عبارت کو کاتبانِ وحی سے لکھوا کر محفوظ تو ضرور کرا دیا تھا، لیکن عوام میں اس کے پھیلنے کا اصل ذریعہ یہ تھا کہ لوگ براہِ راست حضور کی زبان سے قرآن کو سن کر یاد کرتے تھے اور پھر حضور سے سیکھنے والے آگے دوسروں کو سکھاتے اور حفظ کرتے تھے۔ اس طرح قرآن کا صحیح تلفظ اور صحیح اعراب، جو عین تنزیل کے مطابق تھا، ہزار ہا آدمیوں کو محفوظ رہا، لیکن معلوم ہوا اور پھر لاکھوں آدمیوں کو حضور کے شاگردوں کی زبانی تعلیم سے حاصل ہوا۔ صحابہ کرام میں ایک معتد بہ گروہ ایسے اصحاب کا تھا جنہوں نے پورا قرآن لفظ بلفظ حضور سے سنا اور یاد کیا تھا۔ ہزار ہا اصحاب ایسے تھے جو قرآن کے مختلف اجزاء حضور سے سن کر یاد کر چکے تھے

اور ایک بہت بڑی تعداد ان صحابیوں کی تھی جنہوں نے حضور کی حیات طیبہ میں تو آپ سے صرف احسن اجزاء قرآن کی تعلیم حاصل کی تھی، مگر آپ کے بعد پورے قرآن کی قرأت لفظ بلفظ ان اصحاب سے سیکھی جو حضور سے اس کو سیکھ چکے تھے یہی اصحاب وہ اصل ذریعہ تھے جن کی طرف بعد کی نسل نے قرآن کی صحیح قرأت (READING) معلوم کرنے کے لیے رجوع کیا۔ اس قرأت کا حصول محض لکھے ہوئے مصحف سے ممکن نہ تھا۔ یہ چیز صرف اسی طرح حاصل ہو سکتی تھی کہ مصحف مکتوب کو ان جیتے جاگتے مصاحف سے پڑھ کر اس کی اصل عبارت تک رسائی حاصل کی جائے۔

یہ بات تاریخ سے ثابت ہے کہ حضرت عثمان رضی اللہ عنہ نے قرآن کے جو مستند نسخے کھوا کر مملکت کے مختلف مراکز میں رکھوائے تھے ان کے ساتھ ایک ایک ماہر قرأت کو بھی مقرر کیا تھا تاکہ وہ ان نسخوں کو ٹھیک طریقے سے پڑھنا لوگوں کو سکھائے۔ مدینہ میں حضرت زید بن ثابت اس خدمت پر مقرر تھے۔ مکہ میں حضرت عبداللہ بن سائب کو خاص طور پر اسی کام کے لیے بھیجا گیا تھا۔ شام میں ثعلبہ بن شہاب، کوفہ میں ابو عبد الرحمن الشلمی اور بصرہ میں عامر بن حید اقصیٰ اس منصب پر مامور کیے گئے تھے۔ ان کے علاوہ جہاں جو صحابی بھی حضور سے براہ راست، یا آپ کے بعد قرآن صحابہ سے قرآن کی پوری قرأت سیکھے ہوئے تھے، ان کی طرف ہزار ہا آدمی اس مقصد کے لیے رجوع کرتے تھے کہ قرآن کا صحیح تلفظ اور صحیح اعراب لفظ بلفظ ان سے سیکھیں۔

ان عام متعلمین قرآن کے علاوہ تابعین و تبع تابعین کے عہد میں ایک گروہ ایسے بزرگوں کا بھی پیدا ہو گیا جنہوں نے خصوصیت کے ساتھ قرأت قرآن میں اختصاص پیدا کیا۔ یہ لوگ ایک ایک لفظ کے تلفظ، طرزی ادا اور اعراب کو معلوم کرنے کے لیے سفر کر کے ایسے اساتذہ کے پاس پہنچے جو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے قریب تر نسبت تلمذ رکھتے تھے، اور ہر لفظ کی قرأت کے متعلق یہ نوٹ کیا کہ اسے انہوں نے کس سے سیکھا ہے اور ان کے استاد نے کس سے سیکھا تھا۔ اسی مرحلے میں یہ بات تحقیق ہوئی کہ مختلف صحابیوں اور ان کے شاگردوں کی قرأت میں کہاں کہاں اور کیا اختلافات ہیں، ان میں سے کون سے اختلافات شاذ ہیں، کون سے مشہور ہیں، کون سے

متواتر میں۔ اور ہر ایک کی سند کیا ہے۔

پہلی صدی کے دورِ آخر سے لیکر دوسری صدی تک اس طرح کے ماہرینِ قرأت کا ایک گروہ کثیر دنیائے اسلام میں موجود تھا، مگر ان میں سے خاص طور پر جن لوگوں کا کمالِ علم تمام امت میں تسلیم کیا گیا وہ حسبِ ذیل سات اصحاب میں جو قرآنِ سبعہ کے نام سے مشہور ہیں:

(۱) نافع بن عبد الرحمن متوفی ۱۶۹ھ یہ اپنے وقت میں مدینہ کے رئیس افراد مانے جاتے

تھے۔ ان کا سب سے زیادہ معتبر سلسلہ تلمذ یہ تھا کہ انہوں نے حضرت عبداللہ بن عباسؓ اور حضرت ابوہریرہؓ سے پورا قرآن پڑھا، انہوں نے ابی بن کعب سے اور انہوں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے

(۲) عبداللہ بن کثیر۔ یہ مکہ کے امام قرأت تھے ۱۵۸ھ میں پیدا ہوئے اور ۲۰۸ھ میں

وفات پائی۔ ان کے خاص استاد عبداللہ بن سائب مخزومی تھے جنہیں حضرت عثمانؓ نے قرآن کے سرکاری نسخے کے ساتھ تعلیم دینے کے لیے مکہ بھیجا تھا۔ اور عبداللہ بن سائب وہ بزرگ تھے جنہوں نے حضرت عمرؓ اور حضرت ابی بن کعب سے پورا قرآن پڑھا تھا۔

(۳) ابو عمرو بن العلاء البصری ۱۸۰ھ میں پیدا ہوئے اور ۱۵۵ھ میں وفات پائی جن میں

اور کونہ و بصرہ کے کثیر التعداد ائمہ قرأت سے علم حاصل کیا۔ ان کے سب سے زیادہ معتبر سلسلہ تلمذ دو

تھے۔ ایک مجاہد اور سعید بن جبیر کا سلسلہ جو حضرت عبداللہ بن عباس کے واسطے سے حضرت ابی

بن کعب تک پہنچتا تھا۔ دوسرا حسن بصری کا سلسلہ جن کے استاد ابو العالیہ تھے اور وہ حضرت عمرؓ

بن الخطاب کے شاگرد تھے۔

(۴) عبداللہ بن عامر۔ یہ اہل شام میں قرأت کے امام مانے گئے۔ ۱۸۰ھ میں پیدا ہوئے

اور ۱۸۰ھ میں وفات پائی۔ بڑے بڑے صحابہ سے قرأت سیکھی تھی۔ ان کے خاص استاد

۱۔ شاذی سے مراد کسی لفظ کی وہ قرأت ہے جو کسی ایک ہی ذریعہ سے معلوم ہوئی ہو۔ مشہور سے مراد وہ

قرأت جس کی روایت کرنے والے متعدد اصحاب ہوں۔ اور متواتر سے مراد وہ قرأت جو کثیر التعداد اصحاب

نے کثیر التعداد اصحاب سے سنی ہو اور نبی صلی اللہ علیہ وسلم سے بھی اس کے سنے والے کثیر التعداد ہوں۔

میغیرہ بن شہاب مخزومی تھے جنہوں نے حضرت عثمانؓ سے قرأت کا علم حاصل کیا تھا۔ پھر حضرت عثمانؓ کے زمانے میں قرآن کا جو سرکاری نسخہ شام بھیجا گیا تھا اس کے ساتھ یہی میغیرہ بن شہاب تعلیم قرأت پر مامور کر کے بھیجے گئے تھے۔

(۵) حمزہ بن حبیب الکوفیؒ سنہ ۸۸ھ میں پیدا ہوئے اور ۱۵۷ھ میں وفات پائی۔ ان کا خاص سلسلہ سند عن الاعشؒ عن یحییٰ بن وثابؒ عن زبیر بن جُبَیْنؓ، عن علیؓ و عثمانؓ و ابن مسعودؓ ہے۔ اپنے وقت میں یہ کوفہ کے امام اہل قرأت مانے جاتے تھے۔

(۶) علیؒ المکسائی۔ یہ حمزہ کے بعد کوفہ کے امام قرأت مانے گئے۔ یہ بیک وقت نحو کے امام بھی تھے اور قرأت کے امام بھی۔ ان کی مجلس میں سینکڑوں آدمی اپنے اپنے مصاحف لیکر بیٹھ جاتے اور یہ قرآن کے ایک ایک لفظ کا صحیح تلفظ، طریق اداء اور اعراب بتاتے جلتے تھے۔

(۷) عاصم بن ابی النجود۔ کوفہ کے شیخ اقرآء۔ ۱۲۷ھ میں وفات پائی۔ ان کے معتبر ترین فدیہ علم قرأت دو تھے۔ ایک زبیر بن جُبَیْنؓ جنہوں نے حضرت عثمانؓ و عبداللہ بن مسعودؓ سے قرأت کا علم حاصل کیا تھا۔ دوسرے عبداللہ بن حبیبؒ المکلی جنہوں نے حضرت علیؓ، حضرت عثمانؓ، حضرت زبیر بن ثابتؓ اور حضرت ابی بن کعبؓ سے قرآن کی تعلیم حاصل کی تھی اور بعد میں حضرت علیؓ نے ان کو امام حسنؓ اور امام حسینؓ کا معلم قرأت مقرر کیا تھا۔ آج قرآن کا جو نسخہ ہمارے ہاتھوں میں ہے وہ انہی عاصم بن ابی النجود کے مشہور ترین شاگرد حفصؓ رشتہ ۱۸۰ھ کی روایت کے مطابق ہے۔

ان سات اصحاب کے علاوہ مزید جن اصحاب کی قراتوں نے شہرت حاصل کی وہ یہ ہیں ابو جعفرؒ یعقوب، خلفؒ، حسن بصریؒ، ابن جُبَیْنؓ، یحییٰؒ الیزیدی اور اشعثؒ بن ذی

ان افراد کے زمانے میں سینکڑوں ہزاروں آدمی ایسے موجود تھے جنہیں انہی ذرائع اور سندوں سے یہ قراتیں پہنچی تھیں جن سے وہ ان کو پہنچی تھیں۔ وہ بھی انہی استادوں کے شاگرد

تھے جن کے یہ لوگ ننگرد تھے اور ان سب کے پاس ہر ایک قرأت کے لیے پورا سلسلہ اسناد موجود تھا جو کسی صحابی کے واسطے سے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم تک پہنچتا تھا۔ اس یمن میں سے کسی امام قرأت کے بارے میں بھی یہ نہیں کہا جاسکتا کہ وہ اپنی قرأت کی روایت میں منفرد تھا۔ واصل ہر ایک کی قرأت کے بکثرت گواہ ذیل سے اسلام کے ہر حصے میں پائے جاتے تھے، اسی وجہ سے ان اماموں کی قرائتیں امت میں مستحکم مانی گئیں۔

مختلف قرائتوں کو رد یا قبول کرنے کے لیے اہل فن کے درمیان جن شرائط پر قریب قریب مکمل اتفاق پایا جاتا ہے وہ یہ ہیں:

اول یہ کہ جو قرأت بھی ہو وہ مصحف عثمانی کے رسم الخط سے مطابقت رکھتی ہو۔ اس الخط میں جس قرأت کی گنجائش نہ ہو وہ کسی حال میں قبول نہیں کی جائے گی۔ مثلاً مصحف عثمانی میں اگر ایک لفظ بعد لکھا گیا ہے تو اس کی قرأت بعد اور بعد تو قبول کی جاسکتی ہے مگر بعدت قبول نہیں کی جاسکتی، کیونکہ وہ مستند سرکاری متن کے خلاف پڑتی ہے۔

دوم یہ کہ قرأت ایسی ہو جو لغت، محاورے اور قواعد زبان کے خلاف نہ ہو اور عبارت کے سیاق و سباق سے مناسبت رکھتی ہو۔

ان دونوں شرطوں کے ساتھ تیسری اہم ترین شرط یہ ہے کہ ایک قرأت اسی صورت میں قابل قبول ہوگی جب کہ اس کی سند معتبر اور مسلسل واسطوں سے نبی صلی اللہ علیہ وسلم تک پہنچتی ہو۔ ورنہ محض یہ بات کہ ایک قرأت کے لیے مصحف کے رسم الخط میں گنجائش ہے اور قواعد زبان کے لحاظ سے بھی ایک سیاق و سباق میں کوئی لفظ اس طرح پڑھا جاسکتا ہے، اس کو قبول کر لینے کے لیے کافی نہیں ہے۔ ہر قرأت کے لیے اس امر کا ثبوت لازماً ہونا چاہیے کہ اس لفظ یا اس عبارت کو حضور نے اس طرح پڑھا تھا یا کسی صحابی کو اس طرح پڑھایا تھا یہی آخری شرط وہ اصل نعمت ہے جس کی بدولت قرائتوں کے وہ بے شمار ممکن اختلافات، جن کی گنجائش مصحف عثمانی کے رسم الخط اور زبان و محاورہ میں نکل سکتی تھی، گھٹ کر چند مستند اختلافات تک

محدود رہے اور ہم کو یہ سعادت میسر ہوئی کہ قرآن حبیباً بنی ہلی اللہ علیہ وسلم نے پڑھایا پڑھایا تھا دیا ہی آج ہم پڑھ سکیں۔

اب رہ گیا یہ سوال کہ معتبر قاریوں کے واسطے سے متواتر اور مشہور سندوں کے ساتھ مختلف قرائتیں ہم تک پہنچی ہیں ان کے اختلافات کی نوعیت کیا ہے؟ کیا انی الواقع حضور نے خود ہی بعض الفاظ کو مختلف طریقوں سے پڑھا لے پڑھایا تھا یا ان میں سے کسی قرائت کو حضور کی طرف غلط نسبت دے دی گئی ہے؟ اور کیا یہ قرائتیں معنی کے لحاظ سے متضاد ہیں یا ان میں کوئی لغت پائی جاتی ہے؟ اس کا جواب یہ ہے کہ انی الواقع حضور ہی نے بعض الفاظ مختلف طریقوں سے پڑھے اور پڑھائے ہیں اور ان مختلف قرائتوں میں درحقیقت تضاد نہیں ہے بلکہ غور کرنے سے ان میں بڑی گہری معنوی مناسبت اور افادیت پائی جاتی ہے۔

مثال کے طور پر ملک یوما الدین کی دو متواتر قرائتیں ہیں۔ عاصم، کسائی، علق اور یعقوب نے کثیر التعداد صحابہ کی سند سے اس کو مَلِکِ یوما الدین روایت کیا ہے، اور دوسرے قاریوں نے بہت سے صحابہ سے اس کی قرائت مَلِکِ یوما الدین نقل کی ہے۔ ایک قرائت کی رو سے ترجمہ ہو گا "روز جزاء کا مالک اور دوسری قرائت کا ترجمہ "روز جزاء کا بادشاہ"۔ غور کیجیے کیا ان دونوں میں تضاد ہے؟ درحقیقت ان دو قرائتوں نے مل کر تو معنی کو اور زیادہ وسعت دے دی اور مدعا کو پوری طرح نکھار دیا۔ سند سے قطع نظر عقل بھی کہتی ہے کہ جبریل نے دونوں قرائتوں کے ساتھ یہ لفظ حضور کو سکھایا ہو گا اور حضور اس لفظ کو کبھی ایک طرح اور کبھی دوسری طرح پڑھتے ہوں گے۔

ایک اور مثال آیت وضو کی ہے جس میں ادھلکھو کی دو متواتر قرائتیں منقول ہوئی ہیں۔ نافع، عبد اللہ بن عامر، حفص، کسائی اور یعقوب کی قرائت اَرْجُکُمْ ہے جس سے پاؤں دھونے کا حکم ثابت ہوتا ہے، اور عبد اللہ بن کثیر، حمزہ بن حبیب، ابو عمرو بن العلاء اور عاصم کی قرائت اَرْجُکُمْ ہے جس سے پاؤں پر مسح کرنے کا حکم نکلتا ہے۔ بظاہر ایک شخص محسوس کرے گا کہ یہ

وہ نون قراتیں متضاد ہیں۔ لیکن نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے عمل سے معلوم ہو گیا کہ دراصل ان میں تضاد نہیں ہے بلکہ یہ دو مختلف حالتوں کے لیے دو الگ الگ احکام کی طرف اشارہ کرتی ہیں۔ بے وضو آدمی کو وضو کرنا ہو تو اسے پاؤں دھونا چاہیے۔ با وضو اگر تجدید وضو کرے تو وہ صرف مسح پر اکتفا کر سکتا ہے۔ وضو کر کے اگر آدمی پاؤں دھونے کے بعد موزے پہن چکا ہو تو پھر بحالت قیام ایک شب و روز تک اور بحالت سفر تین شب و روز تک وہ صرف موزوں پر مسح کر سکتا ہے۔ حکم کی یہ وسعت ان دو قراتوں کی بدولت ہی واضح ہوتی ہے۔

اسی طرح دوسرے جن جن مقامات پر بھی قرآن کی متواتر اور مشہور قراتوں میں اختلافات پائے جاتے ہیں ان میں کسی جگہ بھی آپ تضاد اور تضادم نہ پائیں گے۔ ہر قرات دوسری قرات کے ساتھ ایک نیا فائدہ دیتی ہے جو تھوڑے سے غور و فکر اور تحقیق سے آپ کو معلوم ہو سکتا ہے۔